فقہ اسلامی اور اجتہاد

حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ
(سابق امیر شریعت رابع امارت شرعیہ بہار واڑیسہ)

ناشر
ایفا پبلیکیشنز

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فقہ اسلامی اور اجتہاد

الحمدللہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ و اصحابہ اجمعین۔

اللہ تعالیٰ کا شکر کس طرح اور کن الفاظ میں ادا کیا جائے کہ نہ ہمارے پاس ادائے شکر کی طاقت ہے، اور نہ اس کے لئے الفاظ کہ اس کی نعمتیں بے پایاں ولامحدود اور ہم و ہماری طاقتیں وصلاحیتیں محدود سے بھی کم، حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادً لِّكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا﴾ (سورہ کہف:۱۰۹)۔

(اگر دریا سیاہی ہو کہ لکھے میرے رب کی باتیں، بے شک دریا خرچ ہو چکے ابھی نہ پوری ہوں میرے رب کی باتیں اور اگر چہ دوسرا بھی لائیں ہم ویسا ہی اس کی مدد کو)۔

غور فرمایئے اس خالق بے نیاز نے وجود بخشا اور ہر موجود کے مناسب اسے ہدایت بھی دی کہ وہ موجود اپنے رب کی ہدایت اور مرضی کے مطابق اپنے وجود کی غرض وغایت کو پورا کر سکے، حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کی زبان سے کہلایا گیا:

﴿رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَى﴾ (سورہ طہٰ:۵۰)۔

(میرا رب وہ ہے جس نے دی ہر چیز کو اس کی صورت پھر راہ سجھائی)۔

غیر ذی شعور مخلوقات کو ہدایات رب کا پابند بنا دیا گیا اور انس وجن کو ہدایات کے ایک حصہ کا پابند کیا گیا اور ایک حصہ میں کچھ اختیار دے کر چھوڑ دیا گیا قرآن کا ارشاد ہوا:

﴿اِنَّا هَدَیْنَاهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّ اِمَّا کَفُوْرًا﴾ (سورہ دہر: ۳)۔

(ہم نے اس کو راہ سجھائی، یا حق مانتا ہے اور یا ناشکری کرتا ہے)۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنایا اور اسے اپنی خلافت و نیابت سے سرفراز فرمایا، اس لئے اس کی ہدایت و رہنمائی عام ہدایت کے ساتھ انبیاء و رسل نیز وحی اور اپنے کلام کے ساتھ فرمائی۔

اور ہدایت خواہ وہ عام مخلوقات کے لئے ہو یا خاص طور پر انس و جن کے لئے، وہ عارضی نہیں، وقتی نہیں بلکہ دائمی و ابدی ہے۔ جب تک عالمین میں مخلوقات کا وجود ہے، یہ ہدایتیں باقی رہیں گی، اور مخلوقات ان سے فائدہ اٹھاتی رہیں گی۔

وحی و نبوت کا سلسلہ سب سے پہلے انسان سیدنا حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے شروع ہوا اور چلتا رہا، اور حضرت اقدس جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر آکر ختم کر دیا گیا۔ قرآن میں ارشاد ہوا:

﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾ (مائدہ: ۳)۔

(آج میں پورا کر چکا تمہارے لئے تمہارا دین اور پورا کیا تم پر میں نے احسان اپنا اور پسند کیا میں نے تمہارے واسطے اسلام کو دین)

ایک جگہ ارشاد ہوا:

﴿مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ وَکَانَ اللّٰهُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا﴾ (سورہ احزاب: ۴۰)۔

(محمد باپ نہیں کسی کا تمہارے مردوں میں سے۔ لیکن رسول ہے اللہ کا اور مہر سب نبیوں پر اور ہے اللہ سب چیزوں کو جاننے والا)۔

یعنی ہدایت بھی مکمل ہو چکی اور نعمت بھی تمام ہو چکی، اور حضرت اقدس محمد رسول

اللہ ﷺ کو آخری نبی بنا کر بھیجا گیا، کہ اب آپ کے بعد کسی طرح کا کوئی نبی نہیں آئے گا۔

انسان کو ہدایت و رہنمائی، وحی الٰہی یعنی کتاب اللہ اور حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ کی لسانی، عملی اور تقریری آیات و احادیث سے ملی، جو بہر حال محدود ہیں، لیکن مخلوقات کے وجود تک ان ہی کو رہنا ہے اور ان ہی کے ذریعہ انسان کو ہدایت حاصل کرنی ہے۔

دوسری طرف انسان کی ضروریات بے شمار اور دنیا میں پیدا ہونے والے مسائل غیر محدود، تو پھر رہنمائی وہدایت کس طرح حاصل کی جائے گی؟

اسی مشکل کے حل کے لئے قرآن میں جا بجا تعقل اور تفکر کی دعوت دی گئی ہے، ایک موقعہ پر واضح طور پر ارشاد ہوا:

﴿فَاعْتَبِرُوْا یا اُولِی الْأَبْصَار﴾ (سورہ حشر: ۲)۔

(عبرت حاصل کرو اے بصیرت والو)۔

فقہاء فرماتے ہیں کہ یہ آیت باب قیاس میں اشارۃ النص ہے، علامہ ابوبکر جصاص رازی نے اپنی مشہور عالم کتاب "احکام القرآن" میں اس آیت کے متعلق لکھا ہے:

"فیه امربالاعتبار والقیاس فی احکام الحوادث ضرب من الاعتبار فوجب استعماله بظاهر الاٰیة"

اس میں اعتبار کا حکم ہے اور جدید پیش آمدہ مسائل میں قیاس اعتبار ہی کی قسم ہے۔ لہذا قیاس کا استعمال ظاہر آیت سے واجب ہوا۔

قاضی بیضاوی نے لکھا ہے:

"واستدل به علیٰ ان القیاس حجة من حیث انه امربالمجاوزة من حال الی حال و حملها علیها فی حکم لما بینهما من المشارکة المقتضیة له"

(اور اسی آیت سے اس بات پر استدلال کیا گیا ہے کہ قیاس بھی حجت ہے؛ اس وجہ سے کہ یہاں ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل ہونے اور حکم کے بارے میں ایک کو دوسرے پر اس علت کی بنیاد پر جو ان دونوں کے درمیان قدر مشترک کے طور پر پائی جاتی ہے۔ محمول کرنے کا حکم دیا گیا ہے)۔

اور علامہ خفاجی نے لکھا ہے:

"قالوا انّا امرنا فی هذه الاية بالاعتبار وهو رد الشئ الی نظيره بان يحكم عليه بحكمه و هذا يشمل الاتعاظ والقياس العقلی والشرعی وسوق الاية للاتعاظ فتدل عليه عبارة و علی القياس اشارة واشتهر الاستدلال بالاٰية علیٰ مشروعية العمل بالقياس الشرعی۔ قالوا انه تعالیٰ امرعنها بالاعتبار وهو العبور والانتقال من الشئ الی غيره وذالک متحقق فی القياس اذ فيه نقل الحكم من الاصل الی الفرع"۔

علماء نے کہا ہے کہ اس آیت کے ذریعہ ہمیں ''اعتبار'' (قیاس) کا حکم دیا گیا ہے اور اعتبار نام ہے کسی چیز کو اس کی نظیر کی جانب لوٹانے کا بایں طور کہ اس پیش آمدہ مسئلہ پر بھی وہی حکم لگایا جائے جو اصل نظیر میں ہے، اور لفظ اعتبار مشتمل ہے نصیحت حاصل کرنے اور قیاس عقلی و قیاس شرعی کے معنوں کو، اور آیت کا سیاق نصیحت وعبرت حاصل کرنے کے لئے ہے۔ پس آیت عبرت ونصیحت کے معنی پر عبارت النص کی بنیاد پر قیاس کے معنیٰ پر اشارۃ النص کی بنیاد پر دلالت کرتی ہے، اور آیت سے قیاس شرعی کی مشروعیت پر استدلال تو مشہور ہے۔ اس لئے علماء نے کہا کہ حق تعالیٰ نے آیت میں اعتبار (قیاس) کا حکم دیا ہے اور اعتبار نام ہے ایک شی سے دوسری شی کی طرف گذرنے اور منتقل ہونے کا اور یہ معنی قیاس میں متحقق ہے۔ کیونکہ اس میں حکم کو اصل سے فرع کی طرف منتقل کرنا ہے۔

حضرت اقدس محمد ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا والی بنا کر بھیجا تو

آپ ﷺ نے حضرت معاذؓ سے پوچھا کہ پیش آمدہ مسائل کے فیصلے کس طرح کرو گے؟ انہوں نے جواب دیا قرآن سے فرمایا گیا اگر قرآن سے تمہیں نہ ملے؟ حضرت معاذؓ نے جواب دیا تو پھر اللہ کے رسول کی احادیث سے، آپ نے فرمایا کہ اگر رسول کی سنت میں بھی وہ مسئلہ نہ ہو؟ حضرت معاذؓ بولے کہ اجتہاد سے کام لوں گا۔ یعنی قیاس سے فیصلہ کروں گا، سرور دو عالم ﷺ کو جوابات سے مسرت ہوئی اور ارشاد فرمایا:

"الحمد لله الذی وفق رسول رسول الله لما یرضی به رسول الله"

(ابوداؤد، ترمذی، دارمی، بحوالہ مشکوٰۃ ۲/ ۳۴۴)۔

(اللہ کا شکر ہے کہ اس نے رسول اللہ کے نمائندہ کو ایسی توفیق خیر بخشی جس سے اللہ کا رسول راضی ہے)۔

سیدنا عمر بن الخطابؓ نے ایک خط حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو لکھا تھا، اس کی حیثیت باب قضاء میں بنیاد و اساس کی ہے اور امام محمدؒ کے الفاظ میں "کتاب السیاسة" ہے، اور دوسرے اہل علم کی اصطلاح میں اس مکتوب کا نام "کتاب سیاسة القضاء وتدبیر الحکم" ہے، اسی خط میں فاروق اعظم تحریر فرماتے ہیں:

"فافهم اذا ادلیٰ الیک"

(جب کوئی معاملہ تمہارے سامنے آئے تو اسے اچھی طرح سمجھو)۔

اور پھر تحریر فرماتے ہیں:

"الفهم الفهم فیما یختلج فی صدرک مما لم یبلغک فی القرآن العظیم والسنة ثم اعرف الامثال والاشباه وقس الامور عندذالک" (بدائع ۹/)۔

(یعنی معاملات کے بارے میں قرآن وسنت سے رہنمائی نہ ملے اور وہ تمہارے دل میں کھٹکیں تو ان پر خوب خوب غور کرو، اور فہم سے کام لو، پھر مثالوں اور نظیروں کو معلوم کرو، اس کے بعد قیاس کرو)۔

سیدنا حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو صحابہ میں اپنے تفقہ اور دینی فہم کے اندر ممتاز ترین شخصیتوں میں سے ایک ہیں، انہوں نے بھی اس طریق کار کی وضاحت فرمادی ہے اور فرمایا ہے کہ اسلام کے آنے سے پہلے ہم پر ایسا وقت گذرا ہے جہاں کسی معاملہ کے فیصلہ اور قضاء کا کوئی سوال ہی نہیں تھا، اور اب اللہ نے ہمیں اس مقام پر پہنچایا ہے جہاں ہم ان امور کے ذمہ دار ہیں، اب ہمارے لئے راہ عمل یہی ہے کہ ہم کتاب اللہ کو رہنما بنائیں۔ اگر کوئی مسئلہ کتاب اللہ میں نہیں ہے تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں کی طرف متوجہ ہوں، اور تیسرے نمبر پر صالحین کے فیصلوں سے روشنی حاصل کریں، اور اگر یہاں بھی مشکل حل نہ ہو تو پھر راہ اجتہاد کی ہے۔

سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی یہی حال تھا۔

"ذکر سفیان ابن عیینة عن عبیداللہ ابن ابی یزید قال سمعت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنهما اذا سئل عن شئ فان کان فی کتاب اللہ قال به و ان لم یکن فی کتاب اللہ و کان عن رسول اللہ ﷺ قال به، فان لم یکن کتاب اللہ ولا عن رسول اللہ ﷺ و کان عن ابی بکر و عمر رضی اللہ تعالی عنهما قال به فان لم یکن فی کتاب اللہ و لا عن رسول اللہ ﷺ ولا عن ابی بکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنهما اجتهد رایه" (اعلام الموقعین ۱/ ۶۳)۔

(عبد اللہ ابن ابی یزید بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ جب ان سے کسی بات کے بارے میں پوچھا جاتا تو اگر اس کا جواب کتاب اللہ میں مل جاتا تو اسی کے مطابق فرمادیتے، ورنہ حضور ﷺ کی احادیث میں نظیر مل جاتی تو اس کے مطابق فتویٰ دیتے، اور اگر ان دونوں میں کہیں کچھ نہ ملتا تو حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے واقعات میں کوئی بنیاد مل جاتی تو اسی کے مطابق فیصلہ فرمادیتے اور اگر مذکورہ جگہوں میں کہیں کچھ نہ مل پاتا تو اجتہاد فرماتے)۔

بہر حال قرآن کی ان آیتوں، احادیث اور آثار صحابہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ابدی ہدایت سے قیامت تک استفادہ کرنے اور ہدایت حاصل کرتے رہنے کی راہ قیاس و اجتہاد ہے، اور اجتہاد کا سلسلہ قرن اوّل سے شروع ہوا ہے، اور جب تک اس کائنات میں انسان موجود ہے یہ سلسلہ جاری رہے گا، کیونکہ اس کے بغیر قرآن وحدیث سے نئے پیش آمدہ مسائل پر کوئی حکم لگانا ممکن نہیں۔

میں اس وقت اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ حضرت اقدس جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد فرمایا کرتے تھے یا نہیں۔ جو حضرات آپ کے اجتہاد کے قائل نہیں ہیں وہ قرآن مجید کی آیت "وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى" پیش کرتے ہیں، اور جو حضرات آپ ﷺ کے لئے اجتہاد ثابت کرتے ہیں وہ اُساریٰ بدر وغیرہ کے واقعات بطور دلیل سامنے لاتے ہیں۔ آپ اجتہاد فرماتے ہوں یا نہ فرماتے ہوں آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو اجتہاد کی تعلیم وتربیت ضرور دی ہے، اور ایسے بہت سے معاملات میں جن سے قرآن وسنت خاموش ہے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے فیصلے فرمائے ہیں اور احکام صادر کئے ہیں۔

حضرت اقدس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد صحابہ کرام نے سب سے پہلا قیاس و اجتہاد سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت سے متعلق کیا اور صحابہ کرام نے کہا:

"رضيه رسول الله لديننا افلا نرضاه لدنيانا"

(جناب رسول اللہ ﷺ نے انہیں ہمارے دین کے لئے پسند فرمایا تو کیا ہم انہیں اپنی دنیا کے لئے نہ پسند کرلیں)۔

خلفاء راشدین وصحابہ کرام سے قیاس و اجتہاد کا ثبوت بہ کثرت ملتا ہے، ایک دفعہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کلالہ کا حکم دریافت کیا گیا (کلالہ وہ میت ہے

جس کے وارثوں میں نہ ماں باپ ہوں نہ اولاد) آپؓ نے فرمایا:

"اقول فیھابرائی فان یکن صواباً فمن اللہ وان یکن خطأً فمنی ومن الشیطٰن"

(اس مسئلہ میں اپنی رائے سے کہہ رہا ہوں۔ اگر میری بات درست ہوئی تو اللہ کی جانب سے ہوئی اور اگر غلط ہوئی تو میری اور شیطان کی جانب سے)۔

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک موقعہ پر میراث میں دادا کے حصہ پانے کے بارے میں ارشاد فرمایا "اقضی فیہ برائی" اس قسم کی روایتیں دوسرے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں بھی بکثرت ملتی ہیں (ملاحظہ ہو: "اعلام الموقعین" جلد اول) جن کی وجہ سے قیاس کی حجیت میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا، علماء اصول کا خیال ہے کہ ہر حکم جو قرآن وسنت سے ثابت ہے اس کی کوئی علت ضرور موجود ہے، اس علت کی تلاش مجتہد کا اصل کام اور اس کا پالینا مجتہد کی کامیابی ہے، قیاس کا مدار اسی علت پر رہا کرتا ہے، اور نئے معاملات ومسائل میں جس سے قرآن وسنت بظاہر ساکت ہیں، علت مشترکہ ہی کی بنیاد پر حکم لگایا جاتا ہے، اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی امر میں قیاس واجتہاد کی بنیاد پر جو حکم دیا گیا ہے وہ دراصل کتاب وسنت ہی کا حکم ہے، جو ظاہر نہ تھا بلکہ علت کی پنہائیوں میں مخفی تھا، قیاس نے اسے کھول کر سامنے کر دیا، اسی لئے اصحاب اصول فقہ لکھتے ہیں:

"القیاس مظھر لامثبت"

قیاس حکم کو ظاہر کرنے والا ہے ثابت کرنے والا نہیں ہے۔

حکم کا ثبوت تو دراصل "نص" سے ہوتا ہے اور مثبت حقیقی خدا تعالیٰ ہے، قیاس واجتہاد کے ذریعہ وہ احکام ظاہر ہوتے رہتے ہیں جو حکم کی علت میں پوشیدہ ہوا کرتے ہیں۔

۱۹۶۴ء میں ''مجمع البحوث الاسلامیه '' (جامع ازهر مصر) کی طرف سے عالمی پیمانہ پر مؤتمر بلائی گئی تھی، جس میں قیاس واجتہاد اور تلفیق مذاہب وغیرہ پر مقالے پڑھے گئے، مؤتمر میں خصوصی طور پر اجتہاد کا موضوع زیر بحث آیا، جامع ازہر کے مایۂ ناز فرزند الدکتور شیخ عبدالحلیم محمود (جو بعد میں شیخ الازہر بھی ہوئے اور ۱۹۷۵ء میں ہندوستان بھی آئے) نے بہت بلیغ انداز میں اجتہاد کی حقیقت اور اس کی کیفیت واضح کی، موصوف نے فرمایا:

''ان الاجتهاد كشف وليس اختراعاً واتباع و ليس ابتداعاً بمعنى ان الاساس فيه هو كشف ما كان عليه الرسول ﷺ ومما تعيّنه النصوص الدينية وارجاع الحوادث الجزئية الجديدة الى قاعدة من قواعد الدين الثابتة وعلىٰ هذا فلا جديد ولا تجديد وليس هناک مما يمكن ان يسمىٰ راياً شخصياً فى الدين لا يستند الىٰ دليل من الكتاب و السنة''۔

اجتہاد طے شدہ اصول کی روشنی میں جدید حالات ومسائل کے شرعی احکام کا انکشاف ہے، کسی نئے حکم کی اختراع نہیں، یہ سابق کی اتباع ہے نئی ایجاد نہیں، یعنی اجتہاد کا بنیادی رکن دینی نصوص کی روشنی میں آنحضور ﷺ کے طریقہ کی تحقیق اور نئی پیش آمدہ جزئیات کا حکم دین کے ثابت شدہ اصول کی روشنی میں معلوم کرنا ہے، اس لئے نہ یہاں کوئی غیر مستند نئی رائے ہے اور نہ کسی نئے اصول کی وضع واختراع اور اسی وجہ سے یہاں کسی ایسی شخصی رائے کی گنجائش نہیں ہے جس کی بنیاد کتاب وسنت نہ ہو۔

بہر حال قیاس واجتہاد بھی وہی معتبر ہے جس کی بنیادیں کتاب وسنت میں موجود ہوں، اور پھر قیاس و اجتہاد اسی جگہ کیا جا سکتا ہے جہاں قرآن وسنت اور اجماع بظاہر ساکت ہوں۔

قیاس و اجتہاد ایک ہی پاک و شفاف چشمے کی دو شاخیں ہیں، فقہاء نے بڑی

طویل اور مفید بحثیں اس پر کی ہیں، قیاس و اجتہاد کی تعریفوں کو سامنے رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر کسی حکم شرعی کو معلوم کرنے کے لئے نصوص کے مالہ و ماعلیہ پر تفصیل کے ساتھ اس طرح غور کیا جائے کہ ان کے الفاظ و معانی اپنے سارے متعلقات کے ساتھ پیش نظر ہوں اور غور کرنے والا اپنی صلاحیت وسعی کی انتہا کر دے، اور مزید غور وفکر اس کے بس سے باہر ہو تو وہ اجتہاد ہے، اور اگر کسی معاملہ سے متعلق نص میں دیئے گئے حکم کی علت کو خواہ وہ ظاہر ہو یا مخفی دوسرے معاملے تک متعدی کیا جائے اور پھر وہی حکم اس پر لگایا جائے تو وہ قیاس ہے، یعنی اجتہاد عام ہے اور قیاس خاص ہے، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

"وقال بعض الفقهاء القياس هوا الاجتهاد وهو خطأ لان الاجتهاد اعم من القياس لانه قديكون بالنظر فى العمومات و دقائق الألفاظ وسائر طرق الادلة سوى القياس" (المستصفی للامام غزالی ۲/۳۴۹)۔

بعض فقہاء نے کہا ہے کہ قیاس اجتہاد ہی ہے، جو درست نہیں۔ اس لئے کہ اجتہاد قیاس کے مقابلہ میں زیادہ عام ہے، کیونکہ قیاس کے برخلاف اجتہاد کبھی عمومات، الفاظ کی باریکیوں اور قیاس کے سوا دلائل کے تمام طریقوں پر غور وفکر کے بعد ہوتا ہے۔

بہر حال دونوں کام بڑے نازک اور بڑی ذمہ داریوں کے ہیں اسی لئے فقہا نے اس کی شرائط تفصیل کے ساتھ لکھی ہیں۔

علامہ شوکانی نے قیاس کی بارہ شرطیں لکھی ہیں اور علامہ تفتازانی نے پانچ، اسی طرح مختلف فقہاء و علماء اصول نے شرطیں بیان کی ہیں، ان میں سے دو شرطیں بنیادی اور اہم معلوم ہوتی ہیں۔

پہلی یہ کہ نص اپنے مورد کے لئے خاص نہ ہو یعنی کسی نص سے یہ بات نہ معلوم ہوتی ہو کہ حکم صرف اسی موقعہ کے لئے دیا گیا ہے، مثال حضرت خزیمہ ذوالشہادتینؓ کا واقعہ

ہے۔حضرت اقدس جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے ایک اعرابی سے اونٹ خریدا اور قیمت چکادی، اعرابی نے قیمت کا دوبارہ مطالبہ کیا آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہیں قیمت دے چکا ہوں، اعرابی نے کہا گواہ لائیے، آپ ﷺ نے فرمایا میرے لئے کون گواہی دے گا جبکہ وہاں کوئی موجود ہی نہ تھا، یہ بات حضرت خزیمہؓ کو معلوم ہوئی، آپ آئے اور کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ قیمت ادا فرما چکے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم یہ گواہی کیسے دے رہے ہو، جبکہ تم وہاں موجود نہ تھے؟ حضرت خزیمہؓ نے عرض کیا:

"یا رسول اللہ انا نصدقک فیما تاتینا به من خبر السماء افلا نصدقک فیما تخبر به من اداء ثمن الناقة"۔

اے اللہ کے رسول! جب کہ ہم ان خبروں کی تصدیق کرتے ہیں جو آپ پر آسمان سے آتی ہیں تم ہم اس خبر کی تصدیق کیسے نہ کریں کہ آپ نے اعرابی کو اونٹ کی قیمت ادا کر دیا ہے۔

جناب رسول اللہ ﷺ نے حضرت خزیمہؓ کی اس اکیلی گواہی کو دو اشخاص کی گواہی کے برابر قرار دیا اور فرمایا:

"من شهد له خزيمة فهو حسبه"

جس شخص کے لئے بھی تنہا خزیمہ گواہی دیں گے وہ اس دعویٰ کے ثبوت کے لئے کافی ہوگی۔

اسی دن سے حضرت خزیمہؓ ذوالشہادتین کہلانے لگے، رسول اللہ ﷺ کے ارشاد نے ایک شخص کی گواہی کا دعویٰ کے ثبوت کے لئے کافی ہونا حضرت خزیمہ کے لئے خاص کر دیا تھا، اس لئے اس حکم پر قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ کسی اور کی بھی اکیلی گواہی دعویٰ کے ثبوت کے لئے کافی ہو۔

دوسری شرط یہ کہ اصل حکم قیاس کے مخالف نہ ہو۔ مثلاً کسی نے سہواً روزہ کی حالت میں کھا پی لیا، اس طرح کا ایک شخص حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر کیا

گیا آپ نے ارشاد فرمایا:

"اتم صومک فانما اطعمک اللہ و سقاک اللہ"

تم اپنا روزہ پورا کرو تمہیں اللہ نے کھلایا اور پلایا ہے۔

تو اس نص سے معلوم ہوا کہ سہواً روزہ کی حالت میں کھا پی لینے کے باوجود روزہ باقی رہتا ہے گرچہ اصولاً ایسے شخص کا روزہ ختم ہو جانا چاہئے، کیونکہ اکل وشرب کا ترک روزہ کا رکن ہے، لیکن اس خلاف قیاس نص کے باعث روزہ باقی رہا تو ایسی نص پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

اجتہاد کے لئے فقہاء کرام اور علماء اصولیین نے بہت سی شرطیں لکھی ہیں، حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنی کتاب "عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید" میں اجتہاد کی شرائط بیان کرنے کے بعد تحریر فرمایا کہ اس موقع پر امام بغوی کی تصریحات کا ذکر کرنا مناسب ہوگا، وہ فرماتے ہیں:

"مجتہد وہ ہے جو پانچ علوم کا جامع ہو، علم کتاب اللہ، علم سنت رسول اللہ، علمائے سلف کے اقوال وآثار کا علم، خواہ کسی مسئلہ میں ان کا اجماع ہو گیا ہو، یا اُن کی آرا باہم مختلف ہوں، عربی زبان کا علم، قیاس کا علم، اور قیاس نام ہے کتاب وسنت سے کسی حکم کو مستنبط کرنے کے طریقے کا جبکہ قرآن وحدیث یا اجماع میں صراحۃً وہ حکم نہ ملے"۔

کتاب اللہ کے سلسلے میں مجتہد کے لئے ضروری ہے کہ اسے ناسخ ومنسوخ، مجمل ومفسر، خاص وعام، محکم ومتشابہ، کراہت، تحریم، اباحت، استحباب اور وجوب کا بھی علم ہو۔

سنت کے سلسلے میں ان باتوں کے علاوہ احادیث صحیح اور ضعیف، مسند اور مرسل کا علم بھی ہونا چاہئے، نیز کتاب وسنت کی باہمی ترتیب اور ان کا ربط اور تعلق بھی جاننا ضروری ہے، تاکہ اگر اس کے علم میں کوئی ایسی حدیث آئے جس کا ظاہر مفہوم کتاب اللہ سے ہم آہنگ نہ ہو تو وہ اس حدیث کا صحیح مفہوم معلوم کر سکے اور اس کی توجیہ بیان کر سکے، کیونکہ

سنت کتاب اللہ کی شرح، اس سے مختلف نہیں ہوسکتی۔

احادیث میں ایک مجتہد کے لئے صرف ان احادیث کا علم ضروری ہے جن کا تعلق احکام سے ہے، اس کے ماسوا بقیہ احادیث کا علم ضروری نہیں۔

عربی زبان کے سلسلے میں ان الفاظ ومحاورات کا علم اسے لازمی طور پر ہونا چاہئے جن کا استعمال احکام بیان کرنے کے لئے کتاب وسنت میں ہوا ہے، اس ذیل میں جس قدر بھی محنت ممکن ہو کی جائے تا کہ کلام عرب کے حقیقی مقصد ومنشاء کو سمجھنے کی استعداد پیدا ہوجائے اور وہ یہ جان سکے کہ مواقع اور حالات کے مختلف ہونے سے مفہوم پر کیا اثر پڑتا ہے۔

عربی زبان کا علم اس لئے ضروری ہے کہ عربی ہی وہ زبان ہے جس میں اللہ کی شریعت نازل ہوئی اور خدا اور اس کے رسول نے اسی زبان میں لوگوں کو مخاطب فرمایا ہے، تو جو شخص اس زبان کا علم نہ رکھتا ہو وہ شارع کے منشاء کو نہیں جان سکتا۔

پھر مجتہد کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ صحابہ وتابعین کے اقوال سے جو احکام نکلتے ہیں ان سے آگاہ ہو، نیز فقہاء امت کے فتاوے اور اجماع سے بڑی حد تک واقف ہو تا کہ وہ حکم بیان کرتے وقت فتاویٰ اور اجماع کی مخالفت سے محفوظ رہے، مجتہد ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس کی نظر ان علوم پنجگانہ کے تمام گوشوں پر اس طرح ہو کہ کوئی شئ بھی اس کی نگاہ سے چھوٹنے نہ پائے، لیکن اگر کوئی شخص ان علوم میں سے کسی ایک علم سے بھی بے بہرہ ہو تو اس کی راہ تقلید ہے، اگر چہ وہ ائمہ سلف میں سے کسی مسلک کا متبحر عالم ہی کیوں نہ ہو۔

جو شخص ان پانچ علوم کا جامع ہو، ہوئ وہوس اور بدعات سے محفوظ ہو، ورع وتقویٰ اس کا شعار ہو، کبائر سے مجتنب اور صغائر پر اصرار کرنے والا نہ ہو، ایسے شخص کے لئے جائز ہے کہ وہ شرعی معاملات میں اجتہاد کرے، منصب قضاء قبول کرے اور فتوی

دے۔

یہ ساری شرطیں مجتہد کے لئے ہیں جس کی یافت اس دور انحطاط میں ناممکن نہیں تو مشکل ترین ضرور ہے، لیکن اگر کوئی شخص ابواب فقہ میں سے کسی باب میں یا مسائل فقہیہ میں سے کسی مسئلہ میں اجتہاد کرنا چاہتا ہوتو اسے اس باب اور اس مسئلہ کے جملہ متعلقات پر حاوی ہونا چاہئے، علامہ تفتازانی نے اپنی مشہور تصنیف توضیح میں لکھا ہے:

"ثم هذه الشرائط فی حق المجتهد المطلق الذی یفتی فی جمیع الاحکام و اما المجتهد فی حکم دون حکم فعلیه معرفة ما یتعلق بذلک الحکم کما ذکره الامام الغزالی" (توضیح ۲/ ۱۸)۔

(یہ شرطیں مجتہد مطلق کے لئے ہیں جو سارے احکام شریعت میں فتوے دیتا ہو، لیکن وہ مجتہد جو بعض احکام میں فتوے دیتا ہو، اس کے لئے صرف یہ شرط ہے کہ وہ جس مسئلہ میں فتویٰ دے رہا ہے، اس کے مالہ وماعلیہ سے پوری طرح باخبر ہو، جیسا کہ امام غزالیؒ نے بیان کیا ہے)۔

حضرت امام غزالیؒ نے اس مسئلہ کو اور واضح کردیا ہے، امام اپنی کتاب "المستصفیٰ" میں تحریر فرماتے ہیں:

"اجتماع هذه العلوم الثمانیة انما یشترط فی حق المجتهد المطلق الذی یفتی فی جمیع الشرع ولیس الاجتهاد عندی منصباً لایتجزی بل یجوز ان یقال للعالم بمنصب الاجتهاد فی بعض الاحکام دون بعض" (المستصفیٰ ۲/ ۳۵۳)۔

(ان آٹھ علوم سے پوری واقفیت کی شرط مجتہد مطلق کے لئے ہے، جو تمام شرعی معاملات میں فتوے دیتا ہو، لیکن میرے نزدیک اجتہاد کوئی ایسا منصب نہیں ہے جو ناقابل تقسیم ہو۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک عالم کو کسی ایک یا دو مسئلے میں منصب اجتہاد حاصل ہے، بقیہ میں نہیں)۔

لیکن اس دور میں ایسے علماء کا پایا جانا بھی جو کسی خاص باب یا کسی خاص مسئلہ میں اجتہاد کرسکیں آسان نہیں، اور مجھے یہ کہنے دیا جائے کہ اس آخیر زمانے میں حضرت مولانا عبدالحئ فرنگی محلی اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہما ہی کے اسمائے گرامی ذہن میں آتے ہیں، ان دونوں حضرات نے اپنی خدمات اور اپنی قیمتی تصانیف سے یہ ثابت کردیا کہ ان تمام علوم پر انہیں اچھی دسترس حاصل ہے، جو ایک مجتہد کے لئے ضروری ہے۔ مذکورہ بالا بحث سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ گرچہ قانون سازی اور تشریع اسلامی کا ماخذ کتاب وسنت ہی ہے، اور قیاس و اجتہاد بھی وہی معتبر ہے جس کی بنیادیں کتاب وسنت میں موجود ہوں، لیکن قیاس و اجتہاد بھی تشریع اسلامی میں مضبوط اور اونچا مقام رکھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قیاس واجتہاد کے ذریعہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے پیغام خداوندی نے قانون شریعت اور فقہ اسلامی کی شکل اختیار کی، انسانی زندگی کے مختلف گوشوں میں پیدا ہونے والے سوالات اور نت نئی ضروریات نے ماہرین شریعت اور فقہائے اسلام کو کتاب وسنت پر اجتہادی انداز میں غور وفکر کی دعوت دی۔ انہوں نے احکام شرعیہ کی علت معلوم کی اور اجتہاد وقیاس کے ذریعہ پیدا ہونے والے سوالات کا جواب دیا اور وہ احکام بتلائے جو بظاہر نئے معلومات ہوتے ہیں، مگر وہ کتاب و سنت کی پنہائیوں میں مخفی تھے، اور اس طرح شریعت کے احکام نے ایک مکمل قانون کی شکل اختیار کرلی؛ اس لئے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسی قیاس واجتہاد پر فقہ اسلامی کا مدار ہے۔

"وعلیه مدار الفقه" (نورالانوار)۔

اور اسی قیاس پر فقہ کا مدار ہے۔

اور اس لئے بھی کہ اگر قانون شریعت اور فقہ اسلامی کا تجزیہ کیا جائے تو مسائل کی کثیر تعداد وہ ہوگی جو قیاس واجتہاد سے معلوم کئے گئے ہیں۔

"فان اکثر مسائل الفقه قیاسیة" (نورالانوار)

(فقہ کے اکثر مسائل قیاسی ہیں)۔

کتاب وسنت کے بعد قیاس و اجتہاد ہی قانون شریعت کا ماخذ ومصدر ہیں، اس طرح اس کی حیثیت صرف ضمنی نہیں بلکہ اصلی اور مستقل معلوم ہوتی ہے، اصولیین نے لکھا ہے:

"الادلة الشرعية ضربان احدها ما يرجع الى النقل المحض والثانى الى الرائ المحض" (الموافقات ۴/۳)۔

ادلہ شرعیہ کی ایک قسم کا تعلق نقل محض سے ہے، اور دوسری کا رائے محض سے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اسلام ایک مکمل دین ہے اور رہتی دنیا تک اسی کو رہنا ہے، قرآن آخری وحی الٰہی ہے اور حضرت اقدس جناب محمد رسول اللہ ﷺ خدا کے بھیجے ہوئے آخری نبی ہیں، اسلامی قانون کا مرجع یہی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہے، ہر آنے والا دور اپنے ساتھ نئے سوالات لاتا ہے، جس کا تعلق انسانی زندگی کے مختلف حصوں سے ہے، ہر نئے سوال کا جواب کتاب وسنت ہی کو دینا ہے، ظاہر ہے اس کے لئے قیاس و اجتہاد کے سوا کوئی دوسری راہ نہیں ہے۔ اجتہاد کی شرائط جن کا اوپر ذکر ہوا ان کا کسی ایک شخص میں پایا جانا مشکل ہی نہیں، ناممکن معلوم ہوتا ہے، تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ نئے مسائل کے حل کی کیا شکل نکلے؟

آج کے حالات میں کسی خاص فرد کو تو یہ فرض سونپ دینا درست نہیں، لیکن علماء اور اصحاب نظر کی ایک جماعت جو دین کے متعلق ضروری علوم میں پوری مہارت رکھتی ہو اور اس کی نگاہ زمانہ حال اور اس کی ضروریات، ملک کے تمدنی وثقافتی معاملات پر گہری ہو، نیز تاریخ اسلام، فقہ اسلامی کے مختلف ادوار اور ان تاریخی عوامل پر بھی نظر ہو جو مختلف مراحل میں قانون پر اثر انداز ہوئے ہوں، نیز ورع وتقویٰ کے زیور سے بھی آراستہ ہوں، اور

کتاب وسنت ، آثار صحابہ، اجماع متقدمین اوراجتہاد فقہاء کو سامنے رکھ کر اپنی پوری صلاحیتیں اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ صرف کریں تو امید ہے کہ ان مسائل کا حل نکل سکے گا، اور ہم اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوسکیں گے، جو شریعت خداوندی کی طرف سے موجودہ حالات میں ہم پر عائد ہوتی ہے۔

یہ اجتماعی طریقہ اجتہاد واستخراج مسائل کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ جسے صرف آج کہا جارہا ہو، بلکہ اس کی مثالیں خیر القرون میں بھی ملتی ہیں ۔

۱ -سیدنا عمر بن الخطابؓ کے زمانہ میں جبکہ اسلامی حکومت کا دائرہ عرب سے باہر نکل کر دور تک پھیل چکا تھا اور اسلام کا علم ایسے ملکوں اور ایسے علاقوں میں نصب کیا جاچکا تھا، جہاں کی زبان ،تہذیب اور اس ملک کے جغرافیائی حالات عرب سے بالکل مختلف تھے، اور اسی بنیاد پر نئے مسائل اکثر وبیشتر سامنے آتے رہتے تھے،عربوں کا تمدن بھی حکومت کے قیام، دولت کی فراوانی اور دوسرے ملکوں سے اختلاط کے باعث دن بہ دن اونچا ہوتا جارہا تھا؛ ان حالات میں صحابہ کرام کی دو مجلسیں بنیں ۔

ایک مجلس تو سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے مرتب فرمائی، جس میں خود خلیفہ دوم،حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم اجمعین شریک تھے ۔

دوسری مجلس سیدنا علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ نے حضرت ابی بن کعب اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم اجمعین کو ساتھ لے کر بنائی ۔

آثار امام محمد میں ہے:

"کان ستة من اصحاب النبی ﷺ یتذاکرون الفقه بینهم ۔عَلِیّ و اُبی و ابوموسیٰ علحدة، عمر۔ زید، ابن مسعود علحدة "(تذکرہ اعظم ص:۱۱ بحوالہ آثار امام محمد)۔

(جناب رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں سے چھ ایسے تھے جو آپس میں فقہ کا مذاکرہ

کرتے تھے، حضرت علیؓ، حضرت ابی بن کعبؓ اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ ایک ساتھ۔ اور حضرت عمرؓ، حضرت زیدؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ایک ساتھ)۔

یہ دونوں مجلسیں وہی کام انجام دیتی تھیں جن کی آج ضرورت محسوس کی جارہی ہے، صحابہ کرامؓ کی جماعت میں ایسے اصحاب موجود تھے جو مسائل بتلاتے اور دینی امور پر فتاوے دیا کرتے، لیکن جب ایسے مسائل سامنے آنے لگے جن سے بظاہر قرآن مجید اور احادیث رسول اللہ ﷺ ساکت نظر آئیں، تو پھر ان مسائل پر صحابہ کرام کی یہ جماعت غور کرتی اور فکر و بحث کے بعد فیصلہ کا اعلان ہوتا۔

صحابہ کرام کے بعد تابعین کے زمانہ میں مدینہ طیبہ کے سات فقہاء کی ایک مجلس کا ذکر ''تهذيب التهذيب'' میں ملتا ہے، اس مجلس کے سامنے وقت کے پیش آمدہ مسائل پیش ہوتے، اصحاب مجلس باہم بحث و مذاکرہ کے بعد کسی فیصلہ کا اعلان کرتے، مدینہ کے قاضی کے سامنے بھی جب کوئی نئے قسم کا مقدمہ آتا تو اس کی روداد ان سات فقہاء کی مجلس کے سامنے پیش کی جاتی اور قاضی اس مقدمہ میں اس مجلس کی رائے لئے بغیر کوئی فیصلہ صادر نہیں کرسکتا تھا۔

"قال علی بن الحسن العسقلانی عن ابن المبارک قال کان فقهاء اهل المدينة سبعة و كانوا اذا جاء تهم المسئلة دخلوا فيها جميعاً فنظروا فيها ولايقضى القاضى حتى يرفع اليهم فينظرون فيها ويصدرون" (تهذيب التهذيب ۳/۷ ۳۴ فی تذکرۃ سالم بن عبداللہ المتوفی ۱۰۶ھ)۔

سات فقہاء اہل مدینہ تھے، جب کوئی نیا مسئلہ پیش آتا وہ سب یکجا غور و فکر کرتے، قاضی بھی اس وقت تک فیصلہ نہیں کرتا تھا جب تک کہ مسئلہ کو ان کے سامنے پیش نہ کردے اور وہ غور و فکر کرکے کوئی فیصلہ کردیں۔

غرض خیر القرون میں بھی جدید مسائل اور پیش آمدہ معاملات کے لئے ایسی

مجلسیں موجود تھیں جو تنقیح مسائل اور استخراج احکام کا انجام دیا کرتی تھیں، مجتہد اعظم ابوحنیفہؒ نے بھی تدوین فقہ اسلامی کا اتنا بڑا اور عظیم الشان کام تنہا نہیں انجام دیا، ''الجواهر المضيئة'' اور ''جامع المسانيد'' وغیرہ کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ امام اعظم نے بھی فقہ اسلامی کا بہت بڑا حصہ اپنے باکمال تلامذہ کی مجلس کے غور وفکر اور بحث و مذاکرہ کے بعد مرتب فرمایا۔

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ فقہی مسائل کو اپنے تلامذہ کی مجلس میں پیش فرمایا کرتے، اور پھر ان پر لمبی لمبی بحثیں ہوتیں، اب اگر یہ مجلس کسی متفقہ مسئلہ پر پہنچی تو وہ قلم بند ہو جاتا یا اس کا اعلان کیا جاتا، ورنہ مجلس کے ہر رکن کی رائے علاحدہ علاحدہ محفوظ کر لی جاتی (الجواہر المضیئۃ ۱؍۲۰ و جامع المسانید ۱؍۳۳)۔

امام اعظم کی اس تدوین فقہ والی مجلس میں جو حضرات شریک ہوتے، ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے فن کا امام تھا۔

مولانا عبد الحی فرنگی محلی (م: ۱۳۰۴ھ) نے عمدۃ الرعایہ میں لکھا ہے کہ یہ مجلس مشاہیر علمائے مجتہدین اور فضلائے متقدمین پر مشتمل تھی، اور پھر اس مجلس کے ارکان کے نام لے کر بتلایا ہے کہ کون کس فن میں امتیاز رکھتا تھا۔

اسی لئے مشہور محدث وکیع بن الجراح کہا کرتے تھے کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے کاموں میں غلطیاں کس طرح رہ سکتی تھیں جب کہ ان کے ساتھ تدوین فقہ اسلامی کے کام میں امام ابو یوسفؒ جیسے قیاس و اجتہاد کے ماہر، یحییٰ بن زکریا بن زائدہ اور حفص بن غیاث جیسے فن حدیث کے ماہر، قاسم بن معن جیسے عربیت اور لغت کے ماہر شریک کار تھے (جامع المسانید ۱؍۳۳)۔

بہر حال تنقیح مسائل اور استخراج احکام کے لئے اجتماعی سعی اور مجالس کے قیام کی نظیریں قرون اولیٰ میں موجود ہیں، جو آج ہماری بہترین رہنمائی کرتی ہیں کہ موجودہ

حالات میں اس اہم ترین کام کی ذمہ داری کسی فرد واحد کو نہ سونپ کر ماہرین فن کی ایک مجلس مرتب کریں، جو پیش آمدہ مسائل پر غور وفکر اور شرعی فیصلہ پر پہنچنے کی ذمہ دار ہو۔

واضح رہے کہ تبدیلی جس تیزی کے ساتھ جاری ہے اور مسئلہ جتنا اہم ہے، اگر اس قسم کی صلاحیت کے لوگ اپنے سارے ضروری مشاغل چھوڑ کر اور پوری طرح یکسو ہوکر اس کام میں مشغول نہ ہو گئے تو عظیم نقصان کا خطرہ ہے۔

☆☆☆